سفرنامہ ترکی ''اپنے استنبول میں'' میں ترک تہذیب و ثقافت کی کھینچی گئی تصویر

رجب درگون
سلجوق یونیورسٹی،قونیہ،ترکی

Abstract

In Urdu Language and Literature alot of term travelogue about Turkey have been written, In this article, Dr. Jafir Hassan Mubark's travelogue has been discuss in which Tuk nation, Turkish language, There Culture and tradations have been described in a beautiful manner. In addition the political, social, economic, and gergraphical espects of Pakistan have been compared with the turkish parallels.

اگر میں یہ کہوں کہ اردو سے میرا تعلق اس دنیا میں آمد کے پہلے ہی دن سے ہوگیا تھا تو ہرگز غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ میرے والدین کا تعلق بحیرہ اسود کے مشرقی وسطی سمت میں واقع ترکی کے خوبصورت شہر اردو سے ہی ہے۔اور میری پیدائش بھی اسی شہر میں ہی ہوئی تھی۔نہ صرف میرے والدین کا تعلق اردو شہر سے ہے بلکہ اردو سے یہ تعلق پچھلی لگ بھگ پانچ پشتوں سے قائم ہے۔میر انیس ببّر سے معذرت کے ساتھ اور مناسبت سے قطع نظر ان کے مشہور شعر کو اگر تبدیل کر کے یوں کہوں تو حرج نہ ہوگا۔

عمر گزری ہے،اسی دشت کی سیاحی میں
پانچوں پشت ہے اردو سے شناسائی میں

جب قدرے ہوش سنبھالا تو اردو کے متعلق یہی سمجھتا رہا کہ یہ ترکی کا 30واں (تیسواں) بڑا شہر ہے جس کا معنی ہے لشکر اور سپاہ۔لیکن جب انقرہ یونیورسٹی میں شعبہ اردو زبان وادب میں بطور طالب علم داخل ہوا تو پتہ چلا کہ جنوبی ایشیا کے ایک ملک پاکستان جو ہمارا سب سے قریبی دوست ہے بلکہ ہائی سکول میں تو ہمیں استاد بتاتے تھے کہ (Pakistan kardesimizdir) یعنی پاکستان ہمارا بھائی ہے۔کی قومی زبان کا نام بھی اردو ہی ہے۔تاریخ کے اساتذہ ہمیں بتاتے تھے کہ اس قوم سے ہمارا رشتہ ایسے وقت سے قائم ہے جب ہمیں ہر سمت سے مخالفت، دوستوں کے حسد اور دشمنوں کی نفرت کا سامنا تھا تو ایسے وقت میں ایک قوم تن من دھن کے ساتھ ہمارے ساتھ کھڑی ہوئی وہ قوم پاکستان ہی کی تھی اور جن افراد اور اقوام پر ہمیں بھروسہ تھا انہوں نے عین وقت پر آکر ہمیں دھوکہ دے دیا۔ترکی

زبان کی ایک کہاوت ہے''Guvendigi daglara kar yagdi''یعنی

تاک میں دشمن بھی تھے اور پشت پر احباب بھی
تیر پہلا کس نے مارا یہ کہانی پھر سہی

ہر ترک آج بھی مسلمانانِ برصغیر کا بالعموم اور پاکستانی قوم کا بالخصوص احسان نہیں بھولا اور آج بھی پاکستان اور پاکستانیوں کے لیے ہماری محبت ہمالیہ کی طرح بلند اور اردو شہر کے پہاڑوں کی طرح مضبوط ہے۔اقبال کی مشہور نظم ''حضور رسالت مآب میں'' تقریباً ہر ترک نے ضرور پڑھی ہوتی ہے۔جس کا آخری شعر پڑھتے ہوئے آج بھی ہماری آنکھیں اشکبار ہو جاتیں ہیں

جھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اس مقالہ کا بنیادی ماخذ اور موضوع محترم ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کا سفرنامہ ترکی بنام ''اپنے استنبول میں''

ہے۔

استنبول میں ترک تہذیب وثقافت کی کھینچی گئی تصویر'' رکھا ہے۔اسی لیے میں نے کوشش کی ہے کہ اس سفرنامہ سے زیادہ باہر نہ نکلا جائے راقم نے کوشش کی ہے کہ مذکورہ سفرنامہ سے باہر نہ نکلا جائے ورنہ ترکی یا ترکوں کی تاریخ،تہذیب وثقافت ایک بڑا موضوع ہے جس کے لیے کئی روز اور کئی نشستیں درکار ہوں گی۔حتیٰ کہ ترکی کے ایک شہر استنبول کی ہی تاریخ کو موضوعِ سخن بنایا جائے تو اس پر بھی کئی طویل نشستوں کا اہتمام کرنا پڑے گا۔

سفر انسان کا سب سے قدیم ساتھی ہے جو آفرینش کے روزِ اول سے ہی اس کے ساتھ مانند سایہ رو بہ گرداں ہے۔پہلے انسان کو اپنی پیدائش کے ساتھ ہی سفر سے پالا پڑا اور آج تک سفر کا نا ختم ہونے والا سفر اس کی ذریت کے ساتھ جزو لاینفک کی طرح چمٹا ہوا ہے۔بہرحال اس دنیا میں ہر انسان کو مختصر یا طویل، بادل نخواستہ سفر کے اس قافلہ کا رکن بننا پڑتا ہے۔تاہم عازمین سفر کے اس قافلہ میں بعض قلم کار،مصنف،سیاح اور ادیب اپنے سفر کی روداد کو زینت قرطاس کرتے ہیں تا کہ وہ حضرات جو ان جگہوں پر نہ گئے ہوں یا جانا چاہتے ہوں ان کے لیے اس جگہ کی تاریخ،محل وقوع،تہذیب وثقافت اور اس خطہ کے لوگوں کی عادات واطوار سے واقفیت حاصل کر سکیں۔

وقت گو ہم سفر، نہ تھا میرا
وقت کے ہم سفر رہا ہوں میں

اس حوالہ سے سفرنامہ لکھنے کی روایت زمانہ قدیم سے ہی رائج ہو چکی تھی اور بہت سے سیاحوں نے سفر نامے لکھے ہیں مثلاً ہندوستان کے حوالہ سے چندر گپت موریا کے زمانہ کے ایک یونانی سفیر میگس تھینس کا انڈیکا سفرنامہ، چینی سیاح کا سفرنامہ، اسی طرح بعد کے ادوار میں البیرونی، ابن بطوطہ سمیت کئی یورپی سیاحوں نے اپنی

رودادِ اسفار تحریر کیں ہیں جو ہندوستان کی تاریخ، تہذیب و ثقافت کے لحاظ سے انتہائی اہم اور معلوماتی ہیں۔ یہ سفرنامے ہی تاریخ اور تہذیبِ اقوامِ عالم کا ایک دوسرا نام ہیں۔ چونکہ ساکنانِ برصغیر اور اناطولیہ کے درمیان قدیمی تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی روابط موجود ہیں اس لیے بہت سے ترک سیاحوں نے بھی برصغیر پاک و ہند کے متعلق اپنے سفرنامہ جات ترکی زبان میں لکھے ہیں۔

اردو زبان کا دامن بھی اس حوالہ سے بھاری ہے جس میں ترکی کے متعدد مقامات کے حوالہ سے سفرنامہ جات تحریر کیے گئے ہیں۔ علامہ اقبال، مولانا ابوالکلام آزاد، قدرت اللہ شہاب، ڈاکٹر جاوید اقبال، سید سلمان حسن ندوی، محمد مبشر نذیر، جعفر حسن مبارک، مستنصر حسین تارڑ سمیت اردو زبان کے تقریباً ہر بڑے ادیب، مصنف اور دانشور نے ترکی اور ترکوں کے حوالہ سے اپنے سفرنامہ یا تاثرات قلم بند ضرور کیے ہیں جن میں ان حضرات نے ترکی اور ترکوں کے حوالہ سے اپنے مشاہدات اور افکار کا ذکر کیا ہے۔ اگر چہ ہماری ذاتی رائے میں جتنی برصغیر کے لوگوں کو ترکی کے لوگوں سے محبت اور رشتہ اخوت وانسیت ہے اس کے مقابلہ میں یہ لکھے گئے سفرنامہ جات محدود ہیں اور اس حوالہ سے ابھی مزید لکھا جا سکتا ہے۔ اس نشست میں شریک تمام اردو ادباء وطلباء کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ بھی جب موقع ملے تو ترکی کا دورہ ضرور کریں اور اس کے حوالہ سے اپنے تاثرات بھی ضرور قلم بند کریں۔

اردو میں ترکی کے حوالہ سے بہت سے سفرنامے تحریر کیے جا چکے ہیں جو سبھی اپنی افادیت اور اہمیت کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔ البتہ اس نشست کے حوالہ سے ہم ان جملہ سفرناموں میں سے ایک اہم سفرنامہ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کا سفرنامہ بنام ''اپنے استنبول میں'' کے متعلق کچھ بات کریں گے۔ یہ سفرنامہ مصنف کی جانب سے ترکی سفر کے دوران مشاہدات اور تجربات کو پیش کرنے کی ایک زبردست کاوش ہے۔ میرے پاس جو اس کی کاپی موجود ہے وہ ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے جو فیصل آباد سے ۲۰۱۰ء میں پہلی بار مثال پبلی کیشنز کی جانب سے شائع ہوئی تھی۔ اس سفرنامہ کو پڑھنے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ مصنف تاریخ اور ادب کے مطالعہ کے دلدادہ ہیں جو ہمیں اس سفرنامے میں بار ہا نظر آتا ہے۔ مصنف نے اس میں ترک تاریخ، تہذیب وثقافت، ترکوں کے رہن سہن کے طریقہ کار کو انتہائی دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے۔ مزید برآں مصنف کے ہلکے پھلکے اندازِ مزاح اور ذوقِ شعری نے اس سفرنامہ کو مزید نکھار دیا ہے۔ جیسا کہ اپنے سفرنامہ کو شروع کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں:

راہ تو مجھ کو دکھا دی خضر
اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے گا

جعفر حسن مبارک کا موضوع بحث یہ سفرنامہ ''اپنے استنبول میں'' کا عنوان اپنے اندر ایک تہذیبی معنویت رکھتا ہے۔ تین لفظوں میں ترکی اور پاکستان کے دوطرفہ تاریخی وثقافتی روابط کو بہ حسن وخوبی سمیٹ دیا گیا ہے۔ ہم اپنی اس تحریر میں ڈاکٹر جعفر حسن مبارک کے اس سفرنامہ بنام ''اپنے استنبول میں'' ترک تہذیب وثقافت کے متعلق مصنف

کے افکار، خیالات اور معلومات کا جائزہ لیں گے۔ ''اپنے استنبول میں'' کے بعض واقعات نہایت دلچسپی کے حامل ہیں۔ یہ سفرنامہ اسلوب کے لحاظ سے رواں دواں اور شعریت کی صفات رکھنے کے ساتھ ساتھ سیلِ شعور کی تکنیک کو اختیار کرکے سفرنامے کے اندر ادبیت کا عنصر بڑی عمدگی سے اجاگر کیا ہے۔ مصنف کے رواں دواں اسلوب نے انھیں مزید دلچسپ بنا دیا ہے اور ان کے اندر حظ اس وقت دو چند ہو جاتا ہے، جب ان واقعات کے کردار ہمیں اپنے اردگرد دکھائی دیتے ہیں لیکن جعفر حسن نے انھیں اپنے انداز میں تحرک آشنا کیا ہے۔ گویا

کچھ خواب ہے، کچھ اصل ہے، کچھ طرزِ ادا ہے

البتہ اس سفرنامہ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے برصغیر پاک و ہند کے ماضی، حال سے خبردار ہونا اشد ضروری ہے۔ اسی لیے اس کو پڑھتے ہوئے بعض باتیں ایسی محسوس ہوئیں جن کا ترکی کے اندر رہنے والے کسی شخص کو کوئی سروکار نہیں۔ جیسے مقامی فنکاروں کے نام، حکایت وغیرہ۔ لیکن اس سب کے باوجود یہ ترکی کے حوالہ سے اردو میں لکھا گیا ایک بہت اچھا سفرنامہ ہے۔

دنیا میں ترکی واحد ایسا ملک ہے جس کی سرزمین خوبصورت اور تاریخی انمول خزانوں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں فطرت اپنی تمام تر رعنائیوں اور حسن و جمال کے ساتھ بے نقاب ہوتی ہے۔ قدم قدم پر فطرت کی سادگی اور انسان کی صناعی کے بے مثال نادر نمونے بکھرے پڑے ہیں جن کی بے پناہ کشش ایک سیاح کے قدم پکڑ لیتی ہے اور وہ وہیں رک کر ان کو دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ترکی دو براعظموں اور دو تہذیبوں کے درمیان ملاپ کے پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ایک طرف ایشیا اپنے قدیم ورثے کے ساتھ سانولے روپ میں جلوہ گر ہے تو دوسری طرف یورپ اپنی جدیدیت کی چمک دمک اور سفید رنگ کے ساتھ پرکشش دکھائی دیا ہے۔

یہ چاند ایک پیالہ مے سے بھرا ہوا ہے
یہ رات جس سے پی کر، نشے میں چل رہی ہے

حقیقت میں ترکی ایک چھوٹا سا خوبصورت جزیرہ ہے جس کے بڑے حصے کا نام اناطولیہ ہے۔ اور یہ جزیرہ تاریخ سے پہلے کے زمانے سے ہی انسانوں کا مسکن ہے اور اس نے بہت سی قدیم تہذیبوں کا عروج و زوال اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سرزمین کی کوکھ سے ایسے ہزاروں آثارِ قدیمہ برآمد ہوئے ہیں جن کا تعلق نو ہزار سال قبل مسیح سے بتایا جاتا ہے۔ اندرونِ اناطولیہ میں کپادوکیا نام کے پہاڑ ہیں جن کے نیچے مکمل شہر آباد تھے۔ اور جن کے اردگرد حفاظتی نقطہ نظر سے بنائی گئیں فصیلیں آج بھی انسان کو حیران کر دیتی ہیں۔

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے اگے نکل گیا ہے کوئی

چونکہ ترکی کا خطہ زمانہ قدیم سے ہی مختلف تہذیبوں اور مذاہب کی آماجگاہ رہا ہے۔ اس لیے یہاں اناطولیہ کے ایک غار میں سینٹ پیٹر کا گرجا گھر ہے۔ جہاں سینٹ پیٹر کے علاوہ سینٹ پال اور سینٹ برنا باس عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہے ہیں۔اناطولیہ میں ہی رومن موزیق کا بہت بڑا عجائب گھر ہے۔اس کے علاوہ بہت سی گمنام عبادت گاہوں، شہروں اور محلات کے کھنڈرات اس علاقے میں موجود ہیں۔ جن کو ابھی تلاشنے کی ضرورت ہے۔اس طرح اناطولیہ میں مختلف مقامات پر یہودیوں نے ساتھ سینیگاگ تعمیر کئے تھے جن کے اب نشانات بھی کہیں نظر نہیں آتے۔اسی طرح آیا صوضیاء سمیت عیسائی دنیا کی بہت سی ابتدائی عبادت گاہیں بھی ترکی میں موجود ہیں۔اناطولیہ میں پہلے ترک مسلم ایمپائر سلجوق حکمرانوں کی بنائی ہوئی مساجد اور مزارت آج بھی سیاحوں کو اپنی طرح کھینچ رہے ہیں جبکہ عثمانی دور کی یادگار مساجد تو سیاحوں اور نمازیوں کو اپنی بہترین معماری طرز اور پرسکون ماحول کی وجہ سے توجہ کا مرکز ہیں۔

ترک قوم:

جب بھی ہم کسی قوم یا کسی بھی سرزمین بارے بات کرنا چاہیں تو ہم سب سے پہلے اس ملک کی آب وہوا، ہریالی اور قدرتی مناظر کے ساتھ ساتھ اس کے باسیوں کے خدوخال اور شکل وصورت کا بھی ذکر ضرور کرتے ہیں۔ترکوں کے حوالے سے لکھی گئی مغربی مصنفین کی کتابوں سے قطع نظر اگر کم سے کم الفاظ میں ترکوں کے اوضاع بیان کرنے کی کوشش کی جائے تو بہرطور ان کی پانچ خصوصیات نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں...... دیانت...... بہادری......استقلال......نظم وضبط......مہمان نوازی......تو ایک ترک کے عمومی خدوخال و کرداری اوصاف مکمل طور پر سامنے آجاتے ہیں۔۔۔ترکوں کے ظاہری خدوخال کا تعین کرنا انتہائی مشکل ہے کیونکہ سلطنت عثمانیہ اور اس سے پہلے قبل مسیح کے ادوار میں مختلف قومیں تہذیبیں اس خطے میں پروان چڑھیں جن کے آثار آج بھی ان کی موجودگی کی دلالت کرتے ہیں۔ مثلاً بحیرہ ایجہ کے کنارے قدیم ٹروجن علاقے کے لوگوں کی جسامت شباہت میں یونانی خدوخال نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ گھنگریالے سیاہ بال، تیز آنکھیں، جسم سخت مگر ملائمت کے نقطہ نظر سے نسوانی...... یہاں آپ کو سرخ ترک بھی ملیں گے عین ممکن ہے کہ ان کے آباؤاجداد شمالی یورپ یا جرمنی سے نقل مکانی کرکے یہاں آباد ہوئے ہوں۔ نیلی آنکھوں، بھورے بالوں، لمبی ناک والے ترک بھی آپ کو ملیں گے۔البتہ وسطی ایشیائی لوگوں سے مشابہت رکھنے والے لوگ میں ملیں گے جو متوسط القد، سیاہ آنکھیں اور سیاہی مائل بال ہوتے ہیں۔نویں صدی کے مشہور مسلمان مورخ بلاذری نے ہندوستان کے بعض جاٹ قبیلوں کو محمد بن قاسم نے حجاج بن یوسف کے پاس بھیجا تھا جس نے ان کو اناطولیہ میں بسایا۔ان کی نسل آج بھی ترکی میں موجود ہے اور انطاکیہ وگردو بیش میں ان کی تعداد ہی زیادہ ہے۔ ہمارے خیال میں آج کون نسلاً ترک ہے کون نہیں ہے اس کا اندازہ لگانا بہت

مشکل ہے اسی لیے بہتر یہی ہے کہ ترکی جمہوری کی سرحدوں میں مقیم ہر شخص ترک ہے...... درحقیقت آج کا ترکی مختلف رنگوں، نسلوں، قومیتوں کے باہمی نسلی اتصال کا ثمرہ ہے۔ ترکی اور ترکوں کے حوالے سے ۱۸۵۲ء میں لکھی گئی بازنطینو ترکیکا نام کی کتاب کا مصنف سکارلوٹوس ترکوں کے خصائص و اوصاف بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ترک عموماً کم آمیز کشیدہ، قامت اور بھرے ہوئے جسم کے ہوتے ہیں۔ چہرے شرافت کے آئینہ دار جب کہ سیاہ ابروں کے نیچے تیز آنکھیں چمکتی ہیں۔ ترک عموماً ضبط و احتیاط سے بات کرتا ہے وہ پہلے سوچے گا پھر منہ کھولے گا...... ترک موسیقی، پھولوں، خوشبوں، مٹھاس اور قہوے کے دلداہ ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب بھی ایک جگہ ترکی اور ترکوں کے رہن سہن اور عمومی صورت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ترک اگر حسن صورت اور حسن سیرت میں بے مثال ہیں تو سرزمینِ ترکی حسن فطرت میں! ترکوں اور ترکی کا یہ جمالِ بے مثال ہمیں گولڈن ہارن کے اردگرد...... انھی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے...... ترک ڈرائیور گاڑی میں غالباً اپنے علاقے کے ''عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی'' کے گیتوں سے خود کو سرشار کیے چلا جارہا تھا...... موسیقی ایک عالمگیر زبان ہے...... جس کا ثبوت یہ بھی تھا کہ...... ہمارے زیادہ تر ساتھی زبانِ ترکی کی عدم آشنائی کے باوجود...... خود کارانہ طور پر موسیقی کے روم پر اپنی حسیاتی ویوز (Waves) ایڈجسٹ کر کے اپنی اپنی روح کو آسودگی سے ہمکنار کرنے میں مگن تھے......'' اگرچہ مصنف ترک گلوکار کا نام بتانے سے تو قاصر رہے ہیں جیسے اس سفرنامہ کو پڑھنے سے قبل میں بھی عطاءاللہ عیسیٰ خیلوی کے نام بے خبر تھا۔ لیکن ان کی چند غزلیں سننے کے بعد میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ ترک گلوکار ہو سکتا ہے ''مسلم گرسس'' ہو۔ کیونکہ جن دنوں مصنف نے ترکی کا دورہ کیا تھا ان دنوں دل جلے ڈارئیور گاڑیوں میں انہی کے گانے لگا کر چلتے تھے۔ اس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ موسیقی ایک عالمگیر زبان ہے جس کی ایک اپنی خاص زبان ہے۔ میرے بہت سے دوست جب کبھی میرے پاس آئیں اور میں مرحوم نصرت فتح علی خان کی غزل ''اللہ ہو اللہ ہو'' سن رہا ہوں باوجود اس کے ان کو کوئی سمجھ نہیں آرہی اس کے باوجود وہ نہ صرف اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ خود بھی فرصت میں خان صاحب کی غزلوں کو سنتے رہتے ہیں۔

ترکی کی سرحدیں کئی جانب سے سمندر سے ملتی ہیں۔ اس لیے مچھلی کا کاربار بھی بہت بڑے پیمانہ پر کیا جاتا ہے۔ ترکی میں ہر سائز کی اور بہت سے مختلف اقسام کی مچھلی پائی جاتی ہے اور جس کو بہت سے مختلف طریقوں سے تیار کر کے سیاحوں اور مقامی لوگوں کو پیش کی جاتی ہے۔ استنبول کے ضلع عمرانیہ اور مرمرہ کے ساحلوں پر مچھلی کے سٹال بڑی تعداد میں لگے ہوتے ہیں جن پر بہت بہترین قسم کی مچھلی دستیاب ہوتی ہے۔ بالخصوص اگر آپ کشتی کے ذریعے استنبول کے یورپی خطہ انونو سے عمرانیہ کی جانب آئیں تو انونو پل پر ہر طرح کی مچھلی تلی ہوئی، سالن کی طرح بنی ہوئی، ہر سائز میں انتہائی مناسب داموں پر دستیاب ہوتی ہے۔ ترکی بھی خاصی حد تک یورپ سے متاثر ہے اس لیے اکثر ہوٹلوں پر خوبرو نوجوان لڑکیاں ویل سوٹ بوٹ ہو کر فرائض میزبانی ادا کر رہی ہوتیں ہیں۔ اگرچہ ان میں سے اکثر ترکی کی بجائے وسطی ایشیا کے ممالک کی خواتین ہوتیں ہیں جو روزگار کے سلسلہ میں استنبول میں قیام

پذیر ہوتیں ہیں۔البتہ یونیورسٹی میں پڑھنے والی ترک بچیوں کی بھی ایک اچھی تعداد اپنی تعلیمی ضروریات یا پھر کسی مجبوری کے باعث پارٹ ٹائمر کے طور پر کام کر رہی ہوتیں ہیں۔

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

کیونکہ کام کرنے والی خواتین کو محض کام کرنے کی وجہ سے کسی بھی قسم کے معاشی یا معاشرتی مسئلہ یا شرمندگی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اس لیے انہیں بھی اپنا کام کرنے میں کسی قسم کی مصیبت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ چنانچہ جعفر حسن اس کو یوں بیان کرتے ہیں۔

''گائیڈ کی ہدایت پر راستے کے ایک طرف اچانک گاڑیوں کو روکا گیا.....سڑک کے ایک طرف فش مارکیٹ اور اس کی گہما گہمی کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔۔۔گائیڈ بتا رہا تھا.....اگر آپ ترکی کے ساحلوں میں پائی جانے والی مچھلیوں کی اقسام کا مشاہدہ کرنا چاہیں.....ی خاص قسم کی مچھلی کے پرچات سے لذتِ کام دھن کا سامان کرنا چاہیں تو یہ جگہ بہت آئیڈیل ہے..... یہاں مچھلی کی دوکانیں بھی ہیں اور ایسے ریسٹورنٹس بھی جو مچھلی کی مختلف ڈشز بنانے میں کمال شہرت رکھتے ہیں یہ فش مارکیٹ صرف فش مارکیٹ ہی نہیں تھی بلکہ اس میں ترکاری کے چھوٹے چھوٹے ٹھیلے بھی موجود تھے جن پر زیادہ تر خواتین ہی ''شاپ کیپر'' کے طور پر موجود تھیں.....'' [۱]

ترکی زبان:

زبان کسی بھی قوم کی تعمیر و ترقی، تہذیب و ثقافت میں انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔اگر چہ ترکی میں کرد، ترک، عرب، آرمینی، یونانی سمیت بہت سی اقوام آباد ہیں۔ جو اپنے گھروں میں یا مقامی طور پر اپنی زبان بولتے ہیں۔لیکن کیونکہ ترکی زبان ملک کی قومی و تعلیمی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ پورے ملک میں سمجھی اور بولی جانے والی زبان ہے۔اس لیے جمہوری ترکی کا ہر غیر ترک شہری بھی تقریباً اس کو بہت احسن انداز ہ سے بولنے، لکھنے اور پڑھنے کی صلاحیت کا حامل ہوتا ہے۔اگر آپ ترکی میں زندگی گزارنا چاہیں یا تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو آپ کو لامحالہ طور پر ترکی زبان سیکھنا ہوگی۔ کیونکہ ترکی زبان سیکھے بغیر آپ کو ترکی کے ہر قدم قدم پر بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

جس طرح سرزمین ترکی اور ترکوں نے زمانے کے بہت اتار چڑھاؤ دیکھے ہیں اسی طرح ترکی زبان بھی عجیب وغریب قسم کے تجربات سے گزر چکی ہے۔مثال کے طور پر سلطنتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد جب جمہوری ترکی کی بنیاد پڑی تو دوسرے بہت سے شعبوں کی طرح زبان میں بھی بڑے پیمانے تبدیلیاں لائیں گئیں۔

اسی طرح جمہوریت کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جب ایک کمیٹی ''اصلاح زبان'' بنائی گئی جس کا مقصد

ترکی زبان سے عربی و فارسی کے الفاظ کی جگہ پر قدیم ترکی یا یورپی زبانوں کے الفاظ کو شامل کرنا تھا۔اس کمیٹی نے جب اپنا کام مکمل کریں تو کمیٹی کے سربراہ نے جمہوری ترکی کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک کو اپنی رپورٹ پیش کرتے ہوئے لکھا کہ ہم نے ترکی زبان سے عربی و فارسی کے تمام الفاظ کو خارج کر دیا ہے۔جس پر عظیم ترک لیڈر مصطفیٰ کمال نے مسکراتے ہوئے اس سربراہ سے پوچھا ''خارج'' کس زبان کا لفظ ہے۔یعنی خارج بھی تو عربی زبان کا ہی لفظ ہے۔تو پھر آپ نے اتنی محنت کس چیز پر کی؟ ترکی زبان کے حوالے سے زیادہ بات نہیں کرنا چاہتا کیونکہ وقت کی کمی بھی ملحوظِ خاطر ہے۔اس کا فائدہ ہوا یا نقصان؟ اور اس تبدیلی کے پیچھے اصل محرکات کیا تھے۔ورنہ آپ سے یہ بھی عرض کرتا کہ ترکی میں کیوں Q اور X نہیں ہیں۔

بہرحال گزشتہ پندرہ (۱۵) برس اردو کی تعلیم وتدریس کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اردو زبان ترکی سے بعض حوالوں سے انتہائی مشکل زبان ہے۔البتہ ترکی اور اردو زبان کے جملوں کی ساخت ایک جیسی ہے یعنی پہلے فاعل پھر مفعول اور آخر میں فعل آتا ہے۔البتہ ترکی میں تذکیر وتانیث کی تقسیم نہیں ہے یعنی وہ سکول گیا یا وہ سکول گئی، وہ ہنس رہا ہے یا وہ ہنس رہی ہے کی بھی کوئی تقسیم نہیں کیونکہ مذکر و مونث کی تقسیم نہیں ہے۔بلکہ مذکر و مونث کے لیے ایک ہی صیغہ استعمال کیا جاتا ہے۔جب کہ اردو میں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔میرے بہت سے طلبہ وطالبات دورانِ درس یہ سوال مجھ سے اکثر پوچھتے رہتے ہیں کہ اردو زبان میں کتاب میز پر پڑھی ہے اور گلاس میز پر پڑا ہے۔یعنی پڑا ہے اور پڑی ہے کیوں ہے؟ کیونکہ ترکی زبان میں ایسی کوئی تفریق نہیں اس لیے ان کو گرائمر کا یہ حصہ سمجھنے میں انتہائی مشکل پیش آتی ہے۔میں بھی ان کو جواب میں اکثر کہتا رہتا ہوں:

نہیں کھیل اے داغؔ یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے

آج ترکی زبان کو لکھتے وقت جن حروفِ تہجی کا استعمال کیا جاتا ہے وہ انگریزی، جرمن، اطالوی سمیت کئی یورپی زبانوں سے ماخوذ ہیں البتہ ان کا تلفظ فارسی یا عربی جیسا ہی ہے۔مثلاً بی ''B'' کو ہم لوگ ''ب'' پی ''P'' کو ''پ'' اور این ''N'' کو ''نون'' پڑھتے ہیں۔اسی طرح ایس ''S'' کو ''س'' اور اگر اس کے نیچے ایک لکیر بنا دی جائے تو وہ ''ش'' پڑھا جاتا ہے۔اس طرح ''C'' کو ''ج'' اور اگر ''C'' کے نیچے چھوٹی سی لکیر کھینچ دی جائے تو وہ ''چ'' بن جاتی ہے۔کبھی کبھی ''C'' کو ''ج'' پڑھنا یا اس جیسے دوسرے الفاظ کا ہیر پھیر بہت تفریح کا موقع بھی فراہم کر دیتا ہے۔میرے ایک بہت اچھے پاکستانی دوست ہیں جو سلجوق یونیورسٹی میں ہی طالب علم ہیں۔وہ کبھی کبھی اپنی فیمیل کلاس فیلوز کو لکھتے ہیں Can you become friend of mine? (کیا آپ میری دوست بننا پسند کریں گی) ابتداء میں تو وہ انگریزی کا ''سی'' ہی رہتا ہے لیکن سمیسٹر کے اختتام تک وہ سی انگریزی زبان سے ترقی کر کے ترکی زبان کا جیم ہو چکا ہوتا ہے۔یوں وہ لفظ جو پہلے انگریزی میں کین ''CAN'' تھا اب ترکی میں جان ''CAN'' بن

چکا ہوتا ہے اور وہ محترمہ اب فرینڈ سے جان کے رتبہ اعلیٰ پر فائز ہو چکی ہوتیں ہیں۔ اب جب بھی اس کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھتا ہوں تو پوچھ لیتا ہوں کہ یہ سی والی ہے یا جیم والی؟ یہ ترکی والی یا انگریزی والی؟

بہر حال اسی بات کو فاضل مصنف اور سیاح ڈاکٹر صاحب یوں اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

''ترکی میں ''C'' عام طور پر ''ج'' کی آواز دیتا ہے...... جبکہ ''J'' جے عموماً ''ژ'' کی آواز دیتا ہے...... H کا حرف ترکی زبان میں ہمارے ہاں کے ''خ'' کی آواز دیتا ہے جیسے اگر ترکی میں خالہ لکھنا ہو تو لکھیں گے HALA ویسے ترکی میں خالہ کا لفظ پھوپھی، چچی وغیرہ کے لیے استعمال ہوتا ہے...... خطا لکھنا ہو تو لکھیں گے...... HATA، بعض ایسے الفاظ میں جو اردو میں ہمارے روزمرہ میں شامل ہیں۔ ترکی زبان میں معمولی صوتی فرق کے ساتھ رائج ہیں مثلاً ہمارے ہاں ماں کو کہا جاتا ہے ''امی'' مگر ترکی میں کہیں گے انی (Anne) ترکی اور انگریزی زبان کے حروفِ تہجی کا موازنہ کیا جائے تو فرق نمایاں طور پر سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ ترکی زبان میں ''Q'' اور ''X'' کے الفاظ موجود نہیں ہیں...... C کے نیچے اگر قوما ہے...... تو اس صورت میں ''C'' چ کی آواز دے گا اور S کے نیچے اگر قوما نظر آئے تو وہ ش کی آواز کا مخرج بنے گا'' [۲]

طنز و مزاح:

ہر ملک میں بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حد سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں یا جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ لاجواب لوگ باکمال سروس دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایک ایسا شہر ہے قیصریہ جہاں اگر پوچھیں کہ کہ دو جمع دو کتنے ہوتے ہیں؟ تو وہ جواب دینے سے پہلے پوچھیں گے آپ لینا چاہیں گے یا دینا چاہیے گے۔ اگر کوئی چیز دینی ہو تو تین اگر لینی ہو تو پانچ ہوتے ہیں۔ مصنف بھی قیصریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''برصغیر میں جیسے ایک اصطلاح بنارس شہر کے حوالہ سے استعمال ہوتی ہے ''بنارسی ٹھگ'' یہاں بھی ایک شہر جیسے قیصریہ کہتے ہیں اپنے باشندوں کی تیز فہمی اور طراری کے لیے شہرت کا حامل ہے...... ترکی میں ایک مثل کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ''فلاں شخص کتنا بھی بدھو کیوں نہ ہو مگر ہے تو قیصریہ کا'' قیصریہ کے ایک شخص کی بابت حکایت بیان کی جاتی ہے کہ اس نے سفید رنگ کا ایک گدھا کسی دوسرے شخص کو فروخت کیا۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد اسے قریب ہی کہیں بندھا ہوا پایا تو کھول کر لے گیا...... سیاہ رنگ یا راکھ وغیرہ پھر کر اس نے سفید گدھے کو سیاہی مائل بنایا اور دوبارہ لے جا کر اسی شخص کے ہاتھ دوبارہ فروخت کر دیا...... استنبول میں قیصریہ والے بہت اکثریت میں

ملیں گے......صرف استنبول ہی کی تخصیص نہیں ہر انٹرنیشنل میگا سٹی کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے۔
آپ یوں کہہ لیں کہ ہر بڑے شہر میں قیصر یہ والے موجود ہوتے ہیں'' ۳؎

استنبول:

افلاکِ استنبول کے انتہائی چمک دار ستاروں کے دل موہ لینے والے نظارے سے آنکھوں کو تابناک بناتے، چاند نام کے اس روشن ایاغ کی مے سے سرشار کہ جس کی بابت احمد نوید نے یہ شعر کہہ رکھا ہے کہ

یہ چاند ایک پیالہ مے سے بھرا ہوا ہے
یہ رات جس سے پی کر، نشے میں چل رہی ہے

استنبول۔۔۔کہ جس کو فتح کرنا ہر مسلمان حکمران کی خواہش تھی۔ بنوامیہ، بنوعباس اور سلجوقوں کے دور میں بار ہا یہ کوشش کی گئیں لیکن اللہ نے یہ سعادت ایک 21 سالہ نوجوان محمد کے نام لکھی تھی۔ جس کو آج سلطان محمد فاتح کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بلکہ ترکی میں تو لوگ ان کا نام پکارنا بھی اچھا خیال نہیں کرتے بلکہ ان کی شخصیت کے ادب کو مدِنظر رکھتے ہوئے محض فاتح ہی لکھتے اور بولتے ہیں۔ جب ۲۹ مئی ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے بہ حثیت فاتح استنبول میں قدم رکھا تو یہ فردوسی کا یہ شعر بطور تمثیل پڑھا

پردہ داری می کند درقصرِ قیصر عنکبوت
بوم نوبت می زند درگنبدِ افراسیاب

استنبول......قدیم دور جس کا دورانیہ ساتویں صدی قبل مسیح سے لے کر چوتھی صدی تک خیال کیا جاتا ہے۔ میں بازنطینی سلطنت کا دارالحکومت رہا۔ بازنطینی کے نام سے اس کا تذکرہ کیا جاتا ہے جب کہ چوتھی صدی عیسوی میں رومیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور اس شہر کو رومن سلطنت کا دارالحکومت بنانے کے لیے روم پر ترجیح دی......رومن بادشاہ کے نام پر اسے قسطنطنیہ کا نام دیا گیا......بحیرہ مارمارا کو بحیرہ اسود سے ملانے والی آبنائے باسفورس کے دنوں سمندری ساحلوں سمیت ۱۲۰۴ء عیسوی میں اس پر لاطینی صلیبیوں نے ہم مذہب بازنطینی فرماں رواکو شکست دے تسلط جمالیا مگر یہ تسلط زیادہ عرصہ برقرار نہیں رہا اور رومن سلطنت کے پہلے بازنطینی وارثان نے اسے بزورِ شمشیر دوبارہ حاصل کر لیا......اور اس کے بعد ترکوں نے ۱۴۵۳ء میں اس کو فتح کر لیا۔

''استنبول کو اعزاز حاصل ہے کہ یہ تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے زمانے کی تین بڑی سلطنتوں جنہیں جدید اصطلاح میں اپنے اپنے دور کی ''سپر پاور'' بھی کہا جاسکتا ہے کا دارالحکومت رہا......مزید برآں دنیا میں کوئی دوسرا ایسا شہر نہیں ہے کہ جو دو سمندروں کے سواحل پر آباد ہونے

کا اعزاز رکھتا ہو'' ۱۴

استنبول کی صدیوں کی داستانِ زندگی آج بھی زندہ ہے۔ یہ ایک زندہ شہر ہے اور ہر دور، تہذیب اور زمانے کی ثقافت کا مرکز رہا ہے۔ آج کا استنبول ان سارے گزرے زمانوں کو بھی اپنے ہمراہ لیے نئی زندگی گزار رہا ہے۔ سمندروں، پہاڑوں، جزیروں اور دو عظیم براعظموں کا سنگم استنبول۔ استنبول کی تاریخ وسیع تاریخ کو یہی پر ختم کرتے ہوئے واپس سفرنامہ کی طرف آتا ہوں اور جعفر حسن کا ایک ایسا واقعہ عرض کرنا چاہوں گا جسے مجھے بھی زندگی میں کئی بار دوسرے ترکی سے باہر دوسرے ممالک میں سفر کے دوران دوچار ہونا پڑا ہے۔ اگرچہ حیدرعلی آتش نے تو کہا تھا کہ

سفر ہے شرط مسافر نوز بہترے
ہزار ہا شجرہ سایہ دار راہ میں ہے

لیکن کبھی کبھی زمینی حقائق اس کے خلاف بھی چلے جاتے اور انسان ششں و پنج میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ کیونکہ سفر کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا کہ مصیبت کا دوسرا نام سفر بھی ہے اور سفر کا دوسرا نام مصیبت۔

استنبول کا ایک واقعہ:

یہ واقعہ اگرچہ جعفر حسن کا ہے لیکن مجھے بھی ذاتی زندگی میں کئی بار ایسے مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہے البتہ بحمدللہ تعالیٰ نتیجہ ہمیشہ ہمارے ہی حق میں رہا ہے۔ چنانچہ جعفر حسن اپنا ایک واقعہ لکھتے ہیں:

''واپس آکر اپنے بیڈ پر نیم دراز ہوئے مجھے ابھی چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ یکلخت دروازے پر ایک مہذب دستک سنائی دی...... میرے کم ان پلیز کہنے پر ایک متناسب جسمانی ساخت کی نیلی جینز پنک بلاؤز میں ملبوس حسینہ کو احتراماً کمر تک جھک کے اندر داخل کیا۔...... میں نے اس حسینہ کے سر پے ذرا گہری نگاہ کیا ڈالی...... میں اس حسینہ کو اپنے کمرے میں پاکر اس لیے حیران و پریشان تھا، حیران اس لیے کہ میں اس حسینہ کی تو کیا، کبھی بھی وزیٹر کی اپنے کمرے میں آمد کی کوئی توقع نہیں کر رہا تھا......اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجائے میں نے اسے اردو میں پوچھا ''جی! محترمہ اپنے تعارف سے آگاہ فرماتے ہوئے حکم کیجیے کہ میں آپ کے کس کام آسکتا ہوں ؟...... مجھے بھول گیا تھا کہ میں استنبول میں ہوں اور وہ مقامی دکھائی دینے والی دوشیزہ یقیناً اردو زبان نہ سمجھتی ہوگی......صورتِ حال کچھ کچھ بھانپ کر بھی...... میں ذہنی طور پر طے نہیں کر پا رہا تھا

کہ مجھے اس صورتِ حال میں اس شریف زادی کو خود اختیاری برہنگی سے بچانے کے لیے کیا قدم اٹھانا چاہیے......اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے بے پایاں فضل وکرم کی بدولت مجھے ایسے واہیات مناظر ''ان دیکھے'' کرنے کی صلاحیت سے نواز رکھا ہے......وہ بی بی بھی ترکی زبان میں کچھ بات کرتی جارہی تھی جو میں سمجھ نہیں پا رہا تھا......''زبانِ یارِ من ترکی و من ترکی نمی دانم'' ......میری زبان سے ''وٹ آر یو ڈوئنگ'' (what are you doing ?) کے تحت سوالیہ الفاظ پھسل گئے......میں نے کہا ''I have not called you''......اس موقع پر اس سمجھدار بی بی نے صورتِ حال کا ادارک کرنے میں دیر نہیں لگائی......فوراً ''او مائی گاڈ'' کہتے ہوئے چند سیکنڈز میں اس نے بلاؤز کے بٹن بند کر لیے اور خدا کا شکر ہے خود ہی کر لیے......پرس اٹھایا اور جس ڈرامائی انداز سے کمرے میں داخل ہوئی تھی اسی طرح اچانک آہستگی سے دروازہ کھول کر چلتی بنی......میں یہ بات دیر تک سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ آخر اسے کس بات کی جلدی تھی کہ وہ بلاؤز کے نیچے کچھ پہنے بغیر ہی چلی آتی تھی......''۵؎

ہر پڑھا لکھا پاکستانی اور ترک ، پاکستان اور ترکی کے ماضی کے تعلقات،حالات اور معاشرت سے واقف ہے۔ دونوں اقوام اور ممالک کے درمیان رشتہ ہمیشہ سے ہی اخوت اور بھائی چارے کا رہا ہے۔ اگر کبھی پاکستان میں کوئی سانحہ ہوتا ہے تو ہمیں بھی ایسے ہی تکلیف ہوتی ہے جیسے ترکی میں کسی ناخوشگوار واقعہ ہونے پر ہوتی ہے۔ پاکستان کی کامیابی ہمیں اپنی کامیابی اور پاکستان کا دکھ ہمیں اپنا دکھ محسوس ہوتا ہے۔ اگر ان دونوں کو کوئی ایک مشترکہ زبان آتی ہوتو وہ یقیناً تحریکِ خلافت اور علامہ اقبال کا نام ضرور سنائے گا۔ اور دونوں ممالک آج بھی تقریبا ایک ہی طرح کے معاشی، معاشرتی، اور سماجی مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔ دونوں ممالک کے پڑوس میں ہر روز جنگ کے شعلے بلند ہو رہے ہیں اور ان ممالک کے مسلم غریب عوام اپنی جانوں کو بچانے کے لیے ان ممالک کا رخ کر ہی ہے۔ دونوں ممالک کو مہاجرین کی اتنی بڑی تعداد اپنے ہاں ہونے کی وجہ سے امن وامان سمیت کئی گمبھیر مسائل میں نہ چاہتے ہوئے بھی الجھنا پڑ گیا ہے۔ ایک قدرتی بات یہ بھی ہے کہ پاکستان اور ترکی کی تاریخ بھی ایک دوسرے سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی ہے۔ جیسے ہمیں یہاں پر ہر پاکستانی محبت اور پیار دیتا ہے ایسے ہی ہر پاکستانی جب بھی وہ ترکی آئے ایسا ہی پیار اور انسیت ملتی ہے۔ آپ استنبول میں جیسے ہی ٹیکسی میں بیٹھیں گے اور انگریزی نہ جانے والا ڈرائیور آپ سے آپ کا تعلق کس ملک سے ہے پوچھے گا۔ پاکستان جواب سنتے ہی خوشی سے اچھل پڑے گا اور Pakistan kardesimizdir, Pakistan Turkey kades ulkiyedir کہنا شروع کر دے گا۔ یعنی پاکستانی تو ہمارے بھائی ہیں، پاکستان اور ترکی دو بھائی ممالک ہیں۔

چنانچہ جعفر حسن استنبول یونیورسٹی کے ایک اجلاس میں طویل تقریر کی جس کے چیدہ چیدہ نقطہ جات بغیر کسی

تبصرہ کے آپ کے گوش گزار کرکے اجازت کا متمنی ہوں۔

مجھ ناچیز میں سوائے ''پاکستانی'' ہونے کے ایسی کوئی خاص خوبی نہیں ہے کہ جس کی بنا پر مجھے اس پرتپاک خیرمقدم کا حقدار گردانا جاتا...... میں نہایت سچائی کے ساتھ سمجھتا ہوں کہ عہدِ حاضر میں دنیا کی کوئی قوم جو اپنی تہذیبی ترقی کے حوالہ سے کسی زعم میں مبتلا ہو...... اپنے تمدن کو ترکوں کے اثرات سے آزاد قرار نہیں دے سکتی...... ترکی اور ترکوں نے دنیا بھر کے تمدن کو جو کچھ دیا ہے اس کا اجمالاً احاطہ کرنا مختصر وقت میں ممکن نہیں تاہم میں اپنے تہذیبی ورثے کے تناظر میں چند گزارشات پیش کرنا چاہوں گا...... مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ میں اپنے تمدن کی طرف دیکھتا ہوں تو ترکی اور ترکوں کے اثرات کی سب سے پہلی گواہی مجھے اپنی قومی زبان ''اردو'' ہی سے مل جاتی ہے اور آپ جانتے ہی ہیں کہ ''اردو'' ترکی زبان ہی کا لفظ ہے۔ اردو زبان کے ارتقاء میں جہاں عربی، فارسی، ہندی اور دوسری مقامی زبانیں حصہ دار ہیں وہاں ترکی زبان میں بھی ایک نہایت فعال عنصر کے طور پر موجود رہی ہیں...... آج برصغیر پاک و ہند جس ''مغل فنِ تعمیر'' پر ناز کرتا ہے اس کی بنیادیں سنان کے ہمعصر اور ہند میں آنے والے ترک معماروں کے ہاتھوں رکھی گئی تھیں۔ کون نہیں جانتا کہ قیامِ پاکستان کے بعد ۱۹۶۰ء میں تعمیر کی گئی ہماری آزادی کی قومی یادگار ''مینارِ پاکستان'' کا نقشہ ترک انجینئر ''مراد خان'' ہی کی عطا ہے...... ہمارے دارالحکومت اسلام آباد کی ۱۹۸۸ء میں تکمیل پانے والی فیصل مسجد ہے اس کا ڈیزائن بھی ترک آرکیٹیکٹ جناب وحدت ویلوے اور ان کے معاون جناب اردولان...... کا عطا کردہ ہے...... ایک نام جو ترکی کی جدوجہد آزادی کے حوالے سے بہت محترم ہے۔ عبدالرحمٰن قریشی کالوں گا جن کا آبائی شہر تو پشاور تھا مگر وہ یوپی سے ہوتے ہوئے استنبول پہنچے...... جنگِ بلقان کے موقع پر ہندوستان سے ہلال احمر کا وفد بھیجا گیا، عبدالرحمٰن قریشی اس میں رکن کے طور پر شامل تھے۔ ۱۹۱۲ء کے بعد ترکی میں مستقل طور پر قیام پذیر ہوتے ہوئے انھوں نے باقاعدہ طور پر ترک آرمی جوائن کر لی۔ بدقسمتی سے ۱۹۳۷ء میں استنبول میں انھیں نامعلوم افراد نے نامعلومات وجوہات کی بنا پر قتل کر دیا۔ قریشی صاحب کے ذکر سے مرادی طور پر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ایسے بہت سے لوگ دونوں ممالک میں موجود ہیں جن کی کئی نسلیں ترکی و برصغیر کے مسلمانوں کے مابین رشتوں کے اٹوٹ بندھن میں آج بھی فعال انٹرایکشن کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔

ماڈرن ہسٹری کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے مجھے کہنے دیجئے کہ ترکی اور پاکستان سیاسی، معاشی، سماجی...... حتیٰ کہ جغرافیائی حوالہ سے کم و بیش ایک جیسے حالات و واقعات کا سامنا رہا ہے...... بسا اوقات تو ایسے حالات و واقعات کی یکسانی ایسی حیرت انگیز مشابہت اختیار کر لیتی ہیں کہ آدمی انگشتِ بہ دندان رہ جاتا ہے...... مثال کے طور پر میں ترکی کے ایک سابق وزیراعظم...... اور مقبول عوامی رہنما...... عدنان میندریس جن کا شمار جدید ترکی کے معماروں میں کیا جاتا ہے اور ہمارے ملک کے ایک سابق وزیراعظم اور مقبول عوامی رہنما ذوالفقار علی بھٹو، جو پاکستانی عوام کو سیاسی شعور سے بہرہ ور کرنے کے سزاوار سمجھے جاتے ہیں کہ شخصیات کا تقابل کیا جائے تو بسا اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ دونوں اپنی جدوجہد، نظریات، طرزِ عمل اور انجام غرض ہر حوالہ سے ایک دوسرے کی ''

مصدقہ نقل''ہیں۔

جغرافیائی طور پر دیکھا جائے تو ترکی ایک ایسی حساس پوزیشن پر واقع ہے کہ دنیا کی کوئی بھی بڑی طاقت......اس کی جغرافیائی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتی،نتیجتاً اس خطے میں بڑی طاقتوں کے''سٹریجک''مفادات کی بنا پر ترکی کو نت نئے چیلنجز کا سامنا رہتا ہے۔بالکل یہی صورتِ حال پاکستان کے ساتھ بھی ہے......روس کی گرم پانیوں تک رسائی کے لیے ترکی سے ملحق سمندر پر ہمیشہ نظر رہی ہے تو پاکستان سے ملحق سمندر کو بھی اس نے اسی توسیع پسندانہ نگاہ سے پیشِ نظر رکھا ہے۔اگر ترکی آبنائے باسفورس کی راہداری کی بنیاد پر عالمی طاقتوں کے سروکار کی زد میں رہا ہے،تو یہی حال پاکستان کا بھی ہے۔''سائپرس''کے حوالے سے یونان کے ساتھ تنازعات کا مسئلہ درپیش ہے تو پاکستان''کشمیر''کے حوالے سے بھارت کے ساتھ الجھا ہوا ہے۔

ہمارے ہاں طلباء کی اخلاقی تربیت کے لیے جو حکایات اور کہانیاں تعلیم کی جاتی ہیں ان میں سے زیادہ تر کا تعلق شیخ سعدی کی گلستان و بوستان کے علاوہ مثنوی مولانا روم سے ہوتا ہے...... ہمارے عظیم مفکر اور شاعر علامہ محمد اقبال کی مولانا جلال الدین رومی بے پناہ عقیدت روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔پیرو مرشد کے عنوان سے بال جبریل میں جو کہ ان ایک شعری مجموعہ ہے۔مرید ہندی اقبال اور پیر رومی مولانا روم ہیں۔مولانا روم کو انہوں نے اپنا روحانی مرشد قرار دیا ہے۔حالانکہ مولانا جلال الدین رومی اور علامہ اقبال کے زمانے میں قریباً آٹھ سو سال کا فاصلہ ہے۔اس ضمن میں ترکی ہی کے قومی شاعر''صفحات''کے مئولف جناب محمد عاکف کا تذکرہ کروں گا جنہوں نے خود اقبال کو دورِ جدید کا مولائے روم قرار دیا تھا۔

اردو ادب کے حوالہ سے دیکھتا ہوں تو اس خطہ ارض سے وابستگی کی چھاپ نظم اور نثر دونوں میں بہت گہری دکھائی پڑنے لگی۔سردست میں ان بے شمار ناولوں کو اپنے ذکر میں لائے بغیر جو ترک جدو جہد آزادی کے پس منظر میں ہمارے ہاں اردو زبان میں لکھے گئے اردو کے ایک معروف افسانہ نگار غلام عباس کے مختصر سے افسانے''ترکی ٹوپی''کا ذکر بطور خاص کرنا چاہوں گا کیونکہ یہ افسانہ اس بات کا سراغ دینے کے لیے بہت کافی ہے کہ برصغیر کا فکشن رائٹر کس سطح تک ترک قوم کے جذبات واحساسات آگاہ رہا ہے......

جنگ عظیم اول کے درمیان جب''شریف مکہ''نے جو خود کو ہاشمی النسل قرار دیتا تھا ترکوں کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر لی۔اور انگریز فوج کا معاون بن گیا تو اس صورت حال میں اقبال بے رنجیدہ ہو گئے،اس المناک صورتِ حال کا پردہ چاک کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا:

بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دین مصطفیٰ خاک وخون میں مل رہا ہے ترکمان سخت کوش
یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرا ۶

حواشی:

۱۔ مبارک، جعفر حسن، اپنے استنبول میں، (فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء) ص: ۷۸۔۷۷
۲۔ ایضاً، ص: ۱۴۸۔۱۴۷
۳۔ ایضاً، ص: ۱۸۲۔۱۸۱
۴۔ ایضاً، ص: ۷۲۔۷۱
۵۔ ایضاً، ص: ۵۸۔۵۵
۶۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال، (لاہور، اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء) ص: ۲۶۳۔۲۶۲

مآخذ:

۱۔ اختر جعفری، ڈاکٹر سید، سیاحوں کی جنت، ترکی، لاہور: علم و عرفان پبلیشرز، ۲۰۱۱ء
۲۔ پراچہ، ڈاکٹر فرید احمد، سفرنامہ ترکی، لاہور: سنگ میل پبلی کشنز، ۲۰۱۲ء
۳۔ علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی، ۱۹۹۰ء
۴۔ غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، استنبول، ترکیہ، لاہور: الفیصل ناشران، ۲۰۰۱ء
۵۔ مبارک، جعفر حسن، اپنے استنبول میں، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۰ء
۶۔ میر انیس، کلیات انیس، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۱۴ء

☆☆☆